# دینی تعلیم اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت

ڈاکٹر محمود احمد غازی

(یہ ایک انگریزی خطاب کا ترجمہ ہے جسے صوتی تسجیل سے سومیہ عزیز، لیکچرار شعبہ تفسیر و علوم القرآن، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد نے بہ راہ راست کمپوز کیا، جب کہ ترجمہ سید متین احمد شاہ، نائب مدیر فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے قلم سے ہے۔)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادرانِ گرامی، خواہرانِ مکرم

سب سے پہلے میں اس کانفرنس کے منتظمین کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے روایتی دینی نظامِ تعلیم، جسے دنیا میں مدرسے کے نام سے جانا جاتا ہے، کے بارے میں اپنے ساتھ ناچیز خیالات کے تبادلے کی عزت مرحمت فرمائی۔ عہد حاضر میں مدرسہ، مشرق و مغرب دونوں میں گرما گرم بحث کا موضوع ہے، دوست و دشمن دونوں کی طرف سے اس کے حق اور مخالفت میں گفتگو جاری ہے۔ مغربی میڈیا مدرسے کو ایک مختلف انداز سے پیش کر رہا ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے ہاں مدرسے کی تصویر کو گہنا کر مسلم تاریخ میں اس کے مثبت کردار کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

لغت میں مدرسے کا مطلب ہے: تعلیم یا تدریس کی جگہ۔ یہ ادارہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے وجود پذیر ہو گیا تھا جس نے علم، فکر و دانش اور سائنسی پیش رفت کے معاملے میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کی نمائندگی کی۔ مدرسے نے تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم اور علم کی وحدت کے تصور کو اجاگر کیا۔ انسانی علم و فکر کی تاریخ میں مدرسے اور اس کے ساتھ وابستہ شخصیات نے وحدت علم کا یہ تصور پیش کیا، جہاں عقل و وحی ایک کل کی حیثیت سے باہم دگر مربوط ہیں۔ یہاں روایتی دینی علم جدید ترین انسانی

دریافتوں کے ساتھ مشترکہ انسانی یافت کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس تصور کے تحت یونانیوں سے متوارث نام نہاد عقلی علوم کے ساتھ ایسا تعامل کیا گیا کہ آخر کار وہ اسلام کے بنیادی اور سرمدی اصولوں کے خادم بن کر رہ گئے۔ ابو نصر فارابی' جسے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں منطق اور مسلم فکر کی تنظیم میں رول ادا کرنے پر مسلمانوں نے معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے، اس جیسے لوگوں نے عموماً سب سے پہلے عقل ووحی کی وحدت اور علم کو ایک کل کی حیثیت سے منضبط طور پر پیش کرنے میں غیر معمولی کاوشیں کیں۔ اس سے وحی اورانسانی مشاہدے اور عقل پر مبنی علم باہم مربوط اور متناسب وحدت کے طور پر سامنے آئے۔ فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات ان کوششوں میں کس حد تک کام یاب ہوئے، اس پر کلام ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ کاوشیں، جن کی وجہ سے مدرسہ وحدت علم کی علامت بن کر سامنے آیا اور مسلمانوں کی فکری روایت اور مدرسے میں حقیقت کی وحدت کو نمایاں کیا گیا، ان کا سہرا ان ہی حضرات کے سر بندھتا ہے۔

یہ روایت، جس کا آغاز فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات کے ہاتھوں نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے ہاتھوں ہوا تھا، گیارہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ جاری رہی۔ ان گیارہ سو سالوں میں علم، جس کی نمائندگی مسلم علما نے مدرسے میں کی تھی، نے انسانی فکراور علم کی ایک عالم گیر متوازی وحدت کی نمائندگی کی۔ ماہرین سائنس، معروف ماہر طبیعیات ابن سینا جیسے لوگوں، محدثین، مفسرین، فقہا، علما، فلسفی وغیرہ حضرات نے ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم وتربیت پائی۔مسلم ہندوستان کی نام ور عبقری شخصیت، جن کا تذکرہ علامہ اقبال نے بھی کیا ہے، مدرسے ہی کی دین تھی۔اقبال نے شیخ احمد سرہندی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے عبقری تھے۔ نواب سعد اللہ خان کئی عشروں پر مشتمل ایک طویل عرصے تک عظیم مسلم مغلیہ سلطنت (جو آج کے افغانستان،پاکستان، کشمیر، انڈیا، نیپال، بنگلا دیش، برما اور سری لنکا کے بعض حصوں پر مشتمل تھی) کے وزیر اعظم رہے ہیں۔ استاد احمد معمار، جو سات عجائباتِ عالم میں تاج محل کے معمار ہیں۔ یہ تینوں شخصیات آپس میں ہم جماعت تھیں اورایک ہی مدرسے کی تربیت یافتہ تھیں۔

اس مثال سے واضح ہے کہ کس طرح انسانی دریافتوں اور فکری تکمیل کے سلسلے میں وحدتِ علم کا ظہور ہوا۔ فن تعمیر، علمی و دینی فکر اور انتظام وانصرام کے شعبہ جات میں ہندوستان کی نہایت بلند پایہ شخصیات مدرسے ہی کی پیداوار تھیں۔

مسلم ہندوستان میں تعلیمی روایت مختلف مدارج سے گزر کر متنوع ابعاد کی شکل میں ڈھلی ہے۔ایک وقت تھا کہ برصغیر میں مسلم انتظام کا دائرہ آج کے پاکستان، وادئ سندھ، ملتان اور اس کے گرد کے علاقے میں محدود تھا۔ برصغیر کی مسلم تاریخ میں یہ عرب دور تھا جب ہندوستان کی روایات عرب مراکز علم، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، مکہ اور مدینہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ یہ جگہیں تعلیم و تعلم کا مرکز تھیں جہاں برصغیر کے اصحاب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے اور اپنے متعلقہ میدانوں میں اعلیٰ مقامات کا حصول کیا۔ علما کی ایک کھیپ ہے جن کے فقہ، سیرت، حدیث، عربی ادب وغیرہ میدانوں میں حصے کا اعتراف شرق اوسط، عراق، عرب اور شام کے علما نے بھی کیا ہے۔عربی شاعری کا منتخب مجموعے حماسہ میں ان حضرات کے قطعات اور نظمیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق سندھ سے تھا۔ ابوعطاسندھی اسی طرح کے ایک عالم تھے جن کی بعض سطور ابو تمام نے منتخب عربی شاعری کے اس مشہور مجموعے میں شامل کی ہیں۔

اس سے عربی فہمی اور عربی کے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے استعمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سطح پر پہنچ چکی تھی جس سے ابو عطا سندھی جیسا شاعر پیدا ہو سکے۔

عرب علمی روایات کی اصطلاح کے اعتبار سے اس کمال کی ایک مثال ابو معشر نجیب سندھی کی ہے جو سیرت اور حدیث میں اپنے کردار کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو نقل نہیں کیا جاسکتا۔برصغیر کی علمی تاریخ میں یہ دور تقریبا چار صدیوں تک جاری رہا۔ وسط ایشیا اور افغانستان سے آنے والے لوگوں اس کے وارث بنے اور ساتویں صدی میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سلطنت دہلی کے قیام نے برصغیر میں اسلامی تعلیم کو ایک نئی اٹھان بخشی۔ اب عرب دنیا کے ساتھ تعلقات شروع میں تو کم زور ہوئے اور پھر تقریبا ختم ہو کر رہ گئے۔ اب تعلقات افغانستان اور وسط ایشیا کے ساتھ قائم ہوئے۔ اب روایات کو افغانستان اور وسط ایشیا سے درآمد کیا جا رہا تھا جن میں زیادہ زور فقہ ،اصول، عربی زبان اور اس کی گرامر پر دیا گیا۔ اسی عہد میں مختلف فنون کے روایتی اور مختصر متون کو ہندوستان میں لایا گیا جو کہ دہلی اور دنیا کے مختلف حصوں کے مدارس میں قائم تعلیم و تدریس کا موضوع بن گئے۔ اشاعت علم اور علمی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ عہد ہندوستان کی تعلیم دینی کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب ابن بطوطہ نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نے دیکھا کہ صرف دہلی میں ایک ہزار سے زائد مدارس تھے جن میں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی۔ اس نے دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علما کا مشاہدہ کیا۔ اس کی ملاقات شیخ عبدالعزیز اردبیلی سے ہوئی جو شام سے محمد تغلق کی دعوت پر آئے تاکہ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کا مدرسہ قائم کریں۔ یہاں تقریبا ہر قصبے اور گاؤں میں مدارس تھے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی اشاعت علم کرتے تھے۔

مدرسے کا کردار صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ ہندوؤں، بدھوں اور دوسروں تک بھی رہا ہے۔ ابھی تک ہندوؤں روایت کے مطابق علم دو مختلف گروہوں میں محدود رہا ہے۔ مذہبی علم ایک مخصوص طبقے میں محدود جب کہ دنیوی علم ایک دوسرے طبقے میں خاص تھا۔ ہندو معاشرے کے دیگر طبقات کو کسی قسم کے علم تک رسائی کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ وہاں مختلف طبقات تھے۔شودر طبقے کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا تھا بلکہ اگر اس طبقے کا کوئی فرد بلاارداہ بھی علم تک رسائی حاصل کر لیتا تو اس کا یہ عمل جرم اور گناہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر سزا دی جاتی تھی۔ یہ قانون ان کی مذہبی کتابوں کی دین تھا۔ مدرسے نے پہلی بار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں (سکھ وہاں نہیں تھے بعد کے دور میں ایسا ہوا) جین مت کے پیروکاروں اور بدھوؤں کے لیے

بھی علم کا در وا کیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا وقت تھا کہ ہندوؤں کے تمام طبقوں نے علم حاصل کیا۔ وہ فارسی زبان کے ماہر بنے جو کہ عدالت، ثقافت اور منڈی کی زبان تھی۔ بدھ، فارسی اور اسلامی قانون کے ماہر بنے۔ بہت سے ہندو، بدھ اور دیگر اہلِ علم ہیں جنھوں نے مدرسے کی بدولت باعث مختلف علوم وفنون میں اپنا اثر چھوڑا ہے۔ تاہم اس عہد میں مدرسے کا ایک منفی پہلو یہ کہ اس میں اشاعت علم اور آزادانہ تحقیق ومطالعے کے باب میں دل چسپی کی کمیابی یا نایابی نظر آتی ہے۔ اب علم کا زیادہ ارتکاز ان متون پر تھا جو وسط ایشیائی یا عرب ممالک میں کہیں تیار ہوئے۔ اصول فقہ، فقہ، منطق اور فلسفے کے متون ہندوستان برآمد کیے گئے اور ان کو درسی کتابوں کی حیثیت دے دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمان علما کا حصہ، جو کہ کمیت میں بڑا تھا لیکن شروحات ہی تک محدود تھا، شروحات اور وسط ایشیا یا عرب دنیا سے آئے ہوئے متون پر حواشی پر مشتمل تھا۔ یہ حصہ حواشی پر حواشی اور پھر ان پر مزید حواشی پر مشتمل تھا۔ کئی کتابیں اس کی مثال ہیں کہ جب آپ کتاب کھولتے ہیں تو ایک گونہ لطف اور پریشانی ہوتی ہے کہ کتاب سے کس طرح استفادہ کیا جائے؟ بہ یک وقت ایک ہی صفحے پر آپ کو دس یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ متون مل جائیں گے جو باہم دگر ملغوبہ بنے ہوتے ہیں۔ اصل متن، شرح، شرح کی شرح، شرح کی شرح کی شرح، پہلی شرح پر حواشی، دوسری شرح پر حواشی، تیسری شرح پر حواشی، حواشی پر حواشی ۔۔۔۔ یہ وہ مجال تھا جو علما کی تگ وتاز کا مرکز تھا۔کوئی شک نہیں کہ یہ ایک علمی سرگرمی اور مصنفین کی عالی دماغی اور اذہان رسا کا عکس تھا، لیکن اس سب کچھ میں ان کی توجہ کتاب کی لفظی موشگافیوں پر مرکوز تھی، خود علم کی خدمت اس نے کم ہی کی۔ اس نے مختلف اسلامی علوم وفنون کی نشوونما میں کمی کے رجحان کو جنم دیا۔ابتدائی عہد کے مسلمان علما نے جو کچھ پانچویں یا چھٹی صدی تک کر لیا تھا اس میں بہت کم مزید حصہ ڈالا گیایاپیش رفت کی گئی۔

تاہم اگر ہم اس منفی پہلو کو نظر انداز کر دیں اور متن سازی کے رجحان پر نظر رکھیں تو ہمیں بہت دل چسپ اور حیرت انگیز مثالیں مل جائیں گی۔ میرے پاس اس وقت کوئی کتاب تو نہیں ہے تاہم مجھے ایک عالم کے تیار کردہ ایک متن کا علم ہے جو ایک مضمون کا

رواں دواں متن تھا۔ پھر اس نے یہ کیا کہ اس نے متن کی نص کو کئی کالموں میں تقسیم کیا کہ اگر متن کو کالموں کے مطابق افقی اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ ایک علاحدہ مضمون کا ایک مختلف متن ہو۔ اگر پیراگراف کو کالموں کی ترتیب سے دیکھا جائے تو پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا کالم ۔۔ ۔ الگ الگ متون کی ترجمانی کرتے ہیں۔ایک ہی صفحے پر سات متن ہوتے باہم دگر ملے ہوتے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ایک متن میں تین مختلف زبانیں داخل کی گئی ہوتی تھیں۔

رواں متن عربی ہے۔ اگر آپ مثلا کالم ایک کو دیکھیں تو یہ فارسی میں ہے، دوسرا ترکی ۔ ۔۔ ۔ یہ شعبدہ بازی (اگر تعبیر کی اجازت دی جائے) مصنف کے ذہنِ رسا کی عکاس، فکرِ گردوں سیر کی غماز اور زبان پر فاضلانہ قدرت کا منہ بولتا اظہار ہے، لیکن اس نے بہ حیثیتِ مجموعی علم کے پھیلاؤ اور مختلف تخصصات کے نشوو ارتقا میں کم ہی کوئی کردار ادا کیا ہے۔ یہ صورتِ حال عہدِ سلاطین کے اختتام اور ہندوؤں اور پھر مغلوں کے ہاتھوں خاندانِ لودھی کے زوال تک جاری رہی۔جب مغل ہندوستان آئے اور ہمایوں کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کیا، تو برصغیر میں ایک اور روایت متعارف ہوئی، یہ روایت فلسفے اور منطق کی تھی جس کی ساخت پرداخت اور اور تانا بانا ایران میں تیار ہوا۔ اب برصغیر اور مدارس کے علمی روابط ایران کے ساتھ استوار ہوئے، اور ایرانی علما بڑی تعداد میں بلائے گئے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اہلِ علم وادب یہاں آئے۔ شاعر، فلسفی، منطق اور دیگر علوم کے ماہرین نے ہندوستان آکرمدارس کے نصاب میں فلسفے اور معقولات یا عقلی علوم کو متعارف کروایا۔ اب اور اس کے بعد کے دور میں مدرسہ دو مختلف روایات کا امین بن گیا: وسط ایشیا اور افغانستان کی روایت جو متن، مختصر متن اور متن پر متن کے ذریعے فقہ اور اصول فقہ پر زور دیتی ہے اور دوسری روایت ایرانی ہے جس میں زور فلسفے اور منطق پر تھا۔ عہدِ مغلیہ میں مدرسے کا یہ بنیادی خاکہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی روایات قائم تھیں جن میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک رویت لکھنؤ میں ایک ادارے فرنگی محل میں پروان چڑھی۔ فرنگی محل ایک اصل میں ایک عمارت کا نام ہے جسے جہانگیر نے برطانوی تاجروں کے ایک گروہ کے لیے مختص کیا تھا جنھیں ہندوستان میں کاروبار اور تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔ان کا دفتر وہیں تھااور اس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں ان سے متعلق شکایات ملیں کہ وہ جہانگیر کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی نہیں کرتے۔ اورنگ زیب نے ان کے خلاف انتظامی کارروائی کی ان سے وہ عمارت چھین کر انھیں اس سے بے دخل کر دیا۔ یہ عمارت مسلمان علما کی ایک جماعت کو دی گئی جس میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ چوں کہ یہ عمارت "فرنگیوں" کی ملکیت میں تھی، اس لیے یہ "فرنگی محل" (قصر مغربیاں) کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ مدرسہ بھی مدرسۂ فرنگی محل (فرنگیوں کے محل یا قلعے میں قائم کردہ مدرسہ) کے نام سے معروف ہوا۔ یہ مدرسہ، اورنگ زیب عالم گیر کے ایک معاصر فقیہ اور عالم مولانا نظام الدین سہالوی نے قائم کیا تھا جنھوں نے عالم گیر کے حکم سے فتاوی عالمگیری مرتب کرنے والی دو سو علما کی کمیٹی کی نگرانی بھی کی تھی۔ آپ کو مدرسہ قائم کرنے کی ذمے داری سونپی گئی جسے آپ نے قائم کیا جس نے فقہ اور اصول کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برصغیر کی علمی روایت پر غیر معمولی اثر مرتب کیا۔ فقہ اہلِ اسلام کا ایک زندہ قانون ہے جو اسلامی شریعت کی حرکی روایت کا امین ہے۔ اس میں ہر زمان و مکاں کے لیے راہ نمائی اور نمو پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ شریعت وہ راہ نما قانون اور نظام ہے جس نے مسلمانوں کی ہمیشہ بھرپور راہ نمائی کی اور ان کو تاریخ کے ہر دور میں کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے قابل بنایا۔ تاہم بدقسمتی سے مدرسے کی یہ تعلیمی شریعت وہ چیز نہ تھی جو زندہ اور متحرک اسلامی روایت سے عبارت ہے۔ یہ بس ان متون تک محدود تھی جو ہندوستان سے باہر کہیں (وسط ایشیا یا عرب دنیا میں) تیار کیے گئے اور جن کے مصنفین کے پیش نظر مختصر نویسی کی مہاتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہوتا تھا؛ جو جس قدر زیادہ اختصار میں ماہر اور مشکل پسند ہوتا، اسی قدر زیادہ مشہور اور ممتاز ہوتا۔ یہ متون مدرسہ فرنگی محل میں پڑھائے جاتے تھے۔ طلبہ سے مطلوب ان متون کو زبانی یاد کرنا اور مصنف وشارح کے طرزِ اطناب اور لفاظی پر توجہ مرکوز کرنا تھا۔ قواعد زبان، فقہ اور اصولِ فقہ اسی طرز پر پڑھائے جاتے تھے۔

اصولِ فقہ کو تفقہ اور نئے اصولِ قانون وضع کرنے کے وسیلے کے طور پر پڑھانے کے بجائے الفاظ کی بازی گری کے طور پر پڑھایا جاتا تھا جس کا ارتکاز کسی مصنف کے متن پر ہوتا تھا۔ یہی حال فقہ کا تھا۔ اس لیے ہماری ناچیز رائے میں مدرسۂ فرنگی محل کے عظیم کردار کے باوجود فقہ اور اصولِ فقہ کے میدان میں اس کا اثر نے حد محدود تھا۔ کوئی نئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی؛ اگر کچھ نئی کتابیں تھیں بھی تو ان

میں کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا گیا، نہ اس میں اصولِ فقہ کی وسیع مجال کا کوئی حصہ نیا شامل کیا گیا۔ کم از کم مدرسۂ فرنگی محل کی یہ صورتِ حال مغلیہ سلطنت کے سقوط تک جاری رہی۔

دوسری رویت جون پور کی تھی جو جنوبی ہندوستان، جنوبی یوپی میں قائم تھی۔ اس کو شیرازِ ہند کہا جاتا تھا۔ شیراز کی علمی روایت کا ارتکاز زیادہ تر فلسفے پر تھا جس کو معقولات یا عقلی علوم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ شیرازِ ہند، جون پور نے بعض بڑے جلیل القدر علما پیدا کیے لیکن ان کی دل چسپی کی تگ و تاز کی جولاں گاہ، ایران سے درآمد شدہ یا ایرانی علما کے پروردہ عقلی علوم تھے۔ جون پور کی تاریخ میں ملا محمود جون پوری سب سے نمایاں شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض علما کے نزدیک وہ امام شاہ ولی کے پایے کی شخصیت تھے۔ بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ وہ نبوغِ علمی اور فکری عبقریت میں شیخ احمد سرہندی کی ہم سر شخصیت تھے، لیکن ان کا یہ سارا فضل وکمال ایران میں رائج اور مشہور فلسفیانہ بحثوں کی تلخیص و اختصار پر مشتمل متون تیار کرنے تک محدود تھا۔ یہ جون پور کی علمی روایت تھی۔

جب امام شاہ ولی اللہ عرب دنیا کے تقریبا پندرہ ماہ کے قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان لوٹے تو انھوں نے ان تعلیمی نظاموں میں کچھ تبدیلیوں اور بہت پیش رفت کو متعارف فرمایا۔ آپ نے فلسفے، الفاظ و متون کی جادو گری اور کتبِ قواعد کی شروح و حواشی کے بہ کثرت استعمال میں ضرورت سے زیادہ توغل کا الغا کر ڈالا اور ایک بہت سادہ اور نئے نصابِ تعلیم کی آب یاری کی جسے اولا ان کے والد گرامی، شاہ عبدالرحیم نے متعارف کروایا تھا۔ امام شاہ ولی اللہ نے اس میں اپنے والد کی سرپرستی میں پڑھے ہوئے نصاب کی تفصیل اپنی خود نوشت سوانح "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں ذکر کی ہے۔انھوں نے اس نصاب کے مختلف پہلوؤں اور متون پر بھی گفتگو کی ہے۔ ابھی تک فرنگی محل، جون پور یا دیگر متعدد اداروں یا مدارس کے نصاب میں قرآن و حدیث کو کوئی نمایاں اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ تعلیم کسی حد تک عمومی تھی اور اس میں کئی مضامین داخل تھے۔ ایک صاحب علم کے اندازے کے مطابق تقریبا ایک چھت تلے اور ایک نظام کے تحت تقریبا چھپن مضامین کی تدریس ہوتی تھی۔ مقصد یہ پیشِ نظر ہوتا تھا کہ طالب علم کو علم کی تازہ ترین پیش رفت

سے آگاہی فراہم کی جائے۔ اس کی بنیاد مختصر متون تھے جن کا یاد کرنا طالب علم کے لیے ناگزیر تھا تاکہ اس کے ہاتھ میں مختلف علوم وفنون کے بنیادی مسائل کی ایک کلید ہاتھ آ جائے۔ اس نصاب میں طب، حساب، جیومیٹری اور اس طرح کے دیگر فنون شامل ہوتے تھے جن کی اساس ایران، وسط ایشیا یا عرب دنیا کے علما کے تیار کردہ مختصر متون تھے۔

امام شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ یہ نصاب اس پایے کا اہل اور جید عالم تیار کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا جو ان کے پیشِ نظر تھا۔ دیگر اداروں میں مروج یونانی فلسفے کے مقابلے میں آپ نے قرآن، حدیث اور اسرارِ شریعت کے مطالعے پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے متعدد متون تحریر کیے جنھیں داخلِ نصاب کیا گیا۔ متنِ حدیث کے مطالعے کے لیے موطا امام مالک مع شروحات لازمی قرار دی گئی متن پر ضرورت سے زیادہ کی روایت کم کی گئی۔ انسانیت، برصغیر اور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پہلا تعارف تھا جس میں نصاب کو قرآن، حدیث اور سیرتِ رسول ﷺ کی بنیاد پر استوار کرنے کی سنجیدہ اور منضبط کوشش کی گئی۔

اس سے پہلے اسی طرح کی ایک کوشش شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی کر چکے تھے جہاں سیرت اور حدیث کی کچھ کتابیں متعارف کروائی گئیں، لیکن شاہ عبدالحق کی وفات کے بعد برصغیر کی علمی روایت میں ان کوششوں کا راستہ بند ہو گیا۔

اور پھر جلد ہی یہ حالت ہو گئی کہ

یہ صورتِ حال تھی جب مغل سلطنت کا سقوط ہوا۔ مدرسۂ فرنگی محل کی روایت وہی رہی۔ شرقِ برصغیر کی روایت جون پور کے طرز ہی پر رہی؛ البتہ دہلی، لکھنؤ اور ٹھٹھہ (اور بعض دیگر شہروں) کے کچھ (چھے یا سات) مدارس نے امام شاہ ولی اللہ کے متعارف کردہ نصاب کی ترویج کی جس میں بنیادی زور فہمِ قرآن اور متن حدیث کے مطالعے پر تھا۔ جب اٹھارویں صدی کے درمیان برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ جما لیا اور مغل بادشاہ، شاہ عالم (شاید شاہ عالم ثانی) کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی پیش رفت ایک دن سارے برصغیر کو قابو میں لے لے گی، تو اس نے کچھ اقدام کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس سیلابِ بلا خیز کا کسی عسکری قوت کے ذریعے مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے اس اٹھتی ہوئی طاقت سے سمجھوتہ کرنے اور تین صوبوں میں اس کی قوت

کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغل بادشاہ نے کمپنی کو ایک چارٹر جاری کیا جس میں اس کو محصول جمع کرنے، انتظامِ مدنی اور بعض دیگر شہری معاملات کی اجازت دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت کی طرف سے ایک چارٹر جاری کیا گیا جس میں اسے محصول کی وصولی، سول انتظام اور بعض دیگر انتظامات کی اجازت دی گئی۔

یہ مغلیہ سلطنت کا بالفعل قانونی زوال تھا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کے تین بڑے صوبے گنوا دیے جو اس وقت سب سے مؤثر صوبے شمار ہوتے تھے۔ بنگال اس وقت مغلیہ سلطنت کا سب سے پر ثروت صوبہ تھا۔ اورنگ زیب کی سب مہمات کا مالی خرچ بنگال کے لگان سے اٹھتا تھا اور مغلیہ سلطنت کا زیادہ تر مدار اسی کے مالی وسائل پر تھا۔ یہ امیر صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور مغلیہ سلطنت تین صوبوں: بنگال، بہار اور اڑیسہ سے اہلِ برطانیہ کے حق میں سبک دوش ہو گئی۔

اس سبک دوشی کے موقع پر جس معاہدے پر دست خط ہوئے، اس وقت اس عمل کو دست برداری نہیں کہا گیا مگر عملا تھی یہ دست برداری۔ معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کے معاملات کو اسلامی عدالتوں میں، مسلمان ججز، قاضیوں اور مفتیوں کی راہ نمائی میں اسلامی شریعت کی رو سے نبھایا جائے گا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس شرط پر راضی ہو گئی اور اس نے تینوں صوبوں کے مختلف حصوں میں عدالتیں قائم کیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے آگے بڑھ کر یوپی اور دلی کے گردونواح کے دیگر صوبوں پر بھی قبضہ جما لیا اور آخر کار ۱۸۰۶ء میں دلی میں داخل ہو گئی تو پھر وہی معاہدہ دوبارہ عمل میں لایا گیا، جس میں دیوانی امور کا قانون کمپنی کو دیگر صوبوں میں لاگو کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت کی صواب دید پر ہندوستان پر حکومت کرنے کی سرکاری اجازت دے دی گئی۔ ان دنوں جب ایک عمومی اعلان کیا گیا تھا تو قانونی دست برداری کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

"تمام مخلوق اللہ کی ہے، تمام کائنات اللہ کی ہے، سلطنت، بادشاہ کا حق ہے لیکن سرکاری فیصلے کمپنی بہادر کے ہیں۔"

کمپنی نے آغاز میں تو مسلمانوں کو کم از کم یہی تاثر دیا کہ وہ معاہدے کی پاس داری کر رہی ہے اور اسلامی عدالتیں قائم کر رہی ہے۔ اس نے عملا ایسے کیا بھی؛ چناں چہ عدالتیں قائم کیں، ان میں قاضی، جج اور مفتیوں کا تقرر کیا۔ اس تقرر میں سہولت اور آسانی

پیدا کرنے کے لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قاضیوں کا انتخاب فرنگی محل یا درسِ نظامی کے فضلا میں سے ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تھے بڑے مربوط طریقِ کار کے حامل لوگ؛ وہ ابھی بھی نظم کے بہت پابند ہیں اور جب بھی انھوں نے کوئی الٹا یا سیدھا کام کرنا ہو تو وہ اسے ایک ضابطے اور قانون کے تحت ہی کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوئی قانون بناتے ہیں، اس کے لیے ضابطے تیار کرتے ہیں، ایک طریقِ کار مہیا کرتے ہیں اور پھر کام کا آغاز کرتے ہیں خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چناں چہ انھوں نے یہ کام بھی ایک قانون اور ضابطے کے تحت ہی کیا۔ وہ طریق یہ تھا کہ قاضی یا مفتی وہی متعین ہوں گے جو درسِ نظامی کے فاضل ہوں گے، ججز کے لیے فقہ حنفی کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گی۔ ہدایہ کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ فتاوی عالم گیری کی انگریزی میں تلخیص کی گئی اور فقہِ حنفی کے بعض بنیادی متون کو برطانوی اہلِ علم نے انگریزی میں منتقل کر دیا۔ اس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کو فقہِ حنفی کے مطابق مختلف معاملات کی قانونی حیثیت سے آگاہی فراہم کرنا تھا۔

اس اقدام نے درسِ نظامی کو سارے ہندوستان میں بہت مقبول بنا دیا، کیوں کہ یہ فضلا کو اعلی مشاہروں پر ملازمت کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ یہ فضلا دیگر اداروں میں کم مشاہرہ پاتے تھے لیکن کمپنی میں ان کو اعلی وظائف دیے جاتے تھے۔ اس وجہ سے درسِ نظامی بہت معروف ہو گیا اور ان دنوں یہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ اب، ۱۷۶۱ء کے بعد درسِ نظامی بہ تدریج ہندوستان کے تمام حصوں میں مقبول ہو تا گیا۔ مدارس نے درسِ نظامی کو اپنے نصاب کے طور پر اختیار کرنا شروع کیا، لیکن تاجِ برطانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ مدارس کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی جس کی مختلف وجوہ ہیں۔

ایک بہت معروف مدرسہ تھا جو ایک طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا۔ اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا اور بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس کالج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے کر اس کا ایک نیا نصاب تشکیل دیا بعض بڑے مسلمان اہلِ علم کا اس میں تقرر کیا۔ انھی میں سے ایک عالم مولانا مملوک علی تھے جو دارالعلوم دیوبند کے

صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی کے والد تھے۔ آپ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علما کے استاد تھے۔ یہ تینوں فضلا مدرسہ غازی الدین–یا دہلی کالج–کے فارغ التحصیل تھے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کوکبِ اقبال کے مکمل طور غروب ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام مدارس کو ختم کر کے رکھ دیا، اوقاف کا نظام تلپٹ کر دیا اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے ساتھ کے گئے معاہدے کو پس پشت ڈال دیا۔ مسلم عدالتیں باقی نہ رہیں، نفاذِ شریعت کالعدم ہو گیا اور قاضیوں اور مفتیوں کا وجود مٹ کر رہ گیا اور سب بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

مدارس کو اوقاف کی امداد، مرکزی حکومت کی توجہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم صوبائی حکومتوں یا امارتوں کی اعانت سے محروم کر دیا گیا اور کسی اسلامی تعلیم کی روایت کو باقی رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

اس صورتِ حال میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی محمد عابد حسین اور بعض دیگر حضرات سامنے آئے اور دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم اور اس کے اداروں کے ختم کرنے کی جو لہر برپا تھی، اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اور روایت کی حفاظت کی ممکنہ حد تک حفاظت کی جا سکے۔ یہ لوگ اسی روایت کے تربیت یافتہ اور درسِ نظامی کے متون اور کتب کے فاضل تھے، اس لیے انھوں نے مدرسے کے نصاب کے لیے درسِ نظامی ہی کو اختیار کیا تاہم اس میں دو بنیادی ترمیمات کیں۔ ابتدا میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ منطق اور فلسفے کی کوئی کتاب بھی داخلِ نصاب نہیں کی جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت چوں کی اصل مسئلہ اسلامی علوم کی حفاظت کا ہے اس لیے قرآن، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا جائے اور انھی کو پڑھایا جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک فلسفے، منطق اور دیگر مضامین کے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ابتدا میں دارالعلوم دیوبند میں ترمیم شدہ درسِ نظامی کے اندر منطق، فلسفہ اور دیگر علوم شامل نہ تھے۔

دوسری اہم ترمیم یہ تھی کہ درسِ نظامی کے اختتام پر حدیث کے ب تعارفی نصاب کو شامل کیا گیا اور پھر آخر میں ایک مستقل سال حدیث کے خصوصی مطالعے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ خاص کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم دیوبند کی تقریبا نوے سالہ طویل کے دوران میں متعدد تبدیلیاں کی گئیں۔ بعد میں فلسفے اور منطق کے علاوہ حدیث کی کچھ مزید کتابیں (طحاوی، مشکاۃ اور موطا امام محمد) بھی شامل کی گئیں۔ کافی بعد میں متنِ قرآن کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا جو غالبا دوسرے یا تیسرے سال سے شروع ہوتا تھا اور آخر تک چلتا تھا جس کے نتیجے میں مکمل قرآن ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ اصولِ تفسیر پر بھی کچھ متون شامل کر دیے گئے۔ شاہ ولی اللہ کی قرآنی فلسفے اور تفسیری اصولوں پر کتاب الفوز الکبیر داخلِ نصاب کی گئی۔

یہ تبدیلیاں مختلف وقفوں سے کی گئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، غالبا ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں امام شاہ ولی اللہؒ کی شاہ کار کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کو ایک تکمیلی ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ کتاب دارالعلوم کے فضلا کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس طرح درسِ نظامی ہم تک پہنچا ہے۔ ۱۸۶۷ء (جب عہدِ برطانیہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی) سے ۱۹۴۷ء (جب ہندوستان خود مختار بنا) تک دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں (جن کی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد تھی) کے بنیادی مقاصد دو تھے۔:

۱- مختلف مساجد میں امام اور خطیب مہیا کرنا

۲- دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر ادوروں میں اساتذہ کی فراہمی

دارالعلوم کے قیام کے یہ دو بنیادی مقاصد تھے۔ آزادی کے بعد خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کے اہداف و مقاصد پر نظر ثانی ضروری ہے۔ اب خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش جیسے آزاد مسلم ممالک اور کافی حد تک ہندوستان کے دینی مدارس کے سامنے وسیع تر مقاصد ہیں جن سے ان کو عہدا برا ہونا چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ درسِ نظامی آیا وہی ہے جو شروع میں تھا یا اس میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اب ہم کو ائمہ اور مدارس میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کے لیے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ یہ

مدارس بیسویں صدی کے شروع میں اگر سو تھے تو آج ان کے مقابلے میں ہزاروں ہیں۔ اب پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے اوران میں لاکھوں طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، اس لیے مذکورہ بالا ضرورت یقینا بڑھ رہی ہے۔ مدارس میں اساتذہ کی فراہمی یقینا ایک بہت بڑی ضرورت ہے، تاہم اس کے مقابلے ہماری تین ضروریات اور بھی ہیں۔

ہمیں سکولوں اور کالجوں کے مرکزی دھارے میں اسلامیات پڑھانے کے لیے اساتذہ درکار ہیں، جب کہ پاکستان میں اسلامیات ایک لازمی مضمون ہے۔ ہمارے پاس نصف لاکھ سے زائد ثانوی سکول، دس لاکھ تک کالج اور سینکڑوں یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان سب اداروں میں اسلامیات ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے ہر ادارے کو مختلف سطحوں پر اسلامیات پڑھانے والا استاد چاہیے۔

پھر ہمیں ایسے اہلِ علم، اصحابِ فضل راہ نماؤں فقہا کی ضرورت ہے جو امتِ مسلمہ کو درپیش چیلنجز کے بارے میں ہماری ملت کو عمومی راہ نمائی دے سکیں۔ ہمیں ایسے ماہرینِ اقتصادیات کی ضرورت ہے جو پاکستان میں تبدیلی لا سکیں۔ وہ موجودہ صورتِ حال سے پاکستان کو ایک اسلامی اور شرعی معاشی نظام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے اسکالرز کی ایک ایک الگ کھیپ درکار ہے۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ موجودہ دینی مدارس صرف پہلے دو اہداف کو پورا کر سکتے ہیں۔ ان کے فضلا کسی حد تک امامت وخطابت یا پھر مختلف مدارس میں تدریس کی ذمے داریاں بجا لا سکتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مدرسہ کے فاضل کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، ایک اچھا امام بننے کے لیے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کراچی، اسلام آباد، لاہور، ڈھاکہ، چاٹ گانگ، دھلی یا بمبئی میں نمازیں پڑھانے والے کو میبذی، ہدایت الحکمت یا شرح ہدایت الحکمت پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اسے شرح جامی کی بال کی کھال اتارنے والی شروحات اور حواشی کی قطعا ضرورت نہیں۔ ہمارے برصغیر اور خاص طور پر صوبہ سرحد (حال خیبر پختون خواہ) میں کافی، اس کی شروحات اور شروحات کی شروحات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ایک طالب علم کافیہ پڑھتا ہے جو کہ عربی نحو کا ایک متن ہے، لیکن یہ پڑھنے والوں کو کبھی نحو نہیں آتی۔ مجھ سے لکھ کر لے لیجیے، ان میں سے ننانوے فی صد ایسے ہیں جن کو درست عربی کا ایک جملہ

بھی لکھنا نہیں آتا۔ وہ درست عربی کا ایک جملہ بھی درست بول نہیں سکتے۔ کافیہ کے ذریعے حاصل کیے گئے ان کے نحوی "کمال" کا یہ عالم ہے۔ اس کا طرزِ تدریس یہ ہے کہ اس کی پہلی سطر پر دو تین ہفتے بحث ہوتی ہے جس کا نحو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کافیہ کا مصنف بے چارہ اس کے شروع میں بسم اللہ یا الحمد للہ نہیں لکھ سکا، اس لیے پہلا سوال ہی یہ قائم کیا جاتا ہے کہ مصنف نے بسم اللہ کیوں نہیں لکھی؟ اب یہاں علمائے کرام خیالی گھوڑے دوڑانے اور قیاسات قائم کرنے لگتے ہیں کہ اس کی یہ یہ وجہ وہ سکتی ہے۔ بال کی کھال اتاری جاتی ہے جس کا عربی نحو سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اور اس سطح پر طالب علم بیچارے کی کوئی استعداد نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ شرح جامی شروع کرتا ہے جو کافیہ کی شرح ہے۔ شرح جامی کا ایک حاشیہ ہے جس کا نام تحریر سنبٹ ہے اور پھر اس کا حاشیہ سوالِ کابلی ہے۔ سوالِ کابلی پر ایک حاشیہ، سوالِ باسولی ہے۔ یہ سب کچھ صوبہ سرحد میں پڑھایا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ دس برس تک یہ کچھ پڑھایا جاتا ہے، یہ حضرات عربی کا ایک جملہ لکھنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر اس کا کچھ فائدہ ہی بھی تو مجھے اس سے انکار نہیں لیکن ایک امام کو ان چیزوں کی کیا ضرورت؟ ان کے مقتدی ان سے یہ سوالات نہیں پوچھیں گے۔ یہ امام اور مدرسے دونوں کے لیے وقت کا ضیاع ہے۔ مستقبل کے متوقع امام کو تیار کرنے کے لیے ان مضامین کی تدریس وسائل کا ضیاع ہے جن کی اسے کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے مقابلے میں اس کو روزمرہ زندگی کے مسائل جاننے کی ضرورت ہے۔ لوگ اسے بینک کے سود کے بارے میں سوال کریں گے۔ لوگ اسے انگلینڈ میں رہن کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ اس سے لیزنگ اور شیئرز کی خرید و فروخت کے بارے میں دریافت کریں گے۔ امام بے چارہ ان سوالوں کو جواب نہیں سے سکتا کیوں کہ اسے یہ چیزیں پڑھائی ہی ہیں گئیں۔

اس لیے میرا احساس یہ ہے کہ ایک امام کے لیے درس نظامی کافی نہیں ہے۔اس میں ترمیم اور تبدیلی اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک درسِ نظامی کے اساتذہ یا اس کی کتابیں پڑھانے والوں کا تعلق ہے تو وہ سارے یا کم از کم بعض یہ نصاب پڑھانے کے اہل اور موزوں ہیں، لیکن او لیول یا اے لیول کے بچوں کو پڑھانے کے لیے مدرسوں کے پڑھے ہوئے لوگ بہ مشکل ہی اہل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ اضافے تقاضے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے اندر اسلامی بینکنگ رواج پا چکی ہے اور اس سے متعلق احکام جاننے کی ضرورت پائی جاتی ہے۔سٹیٹ بنک آف پاکستان نے پاکستان میں اسلامی طرز کے مطابق بنکاری کی خواہش رکھنے والے بنکوں کے لیے ایک قانونی فریم ورک قائم کیا ہے تاکہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز کو پروان چڑھایا جا سکے۔ سٹیٹ بنک کا یہ مطالبہ ہے کہ جو بنک یا تمویلی ادارہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز اور آلات کا خواہش مند ہے، اس میں ایک شریعہ اڈوائزر ہونا چاہیے۔ ملکی سطح پر انھوں نے ایک شریعہ بورڈ قائم کیا ہے جس نے دوسرے بنکوں میں لاگو کرنے کے لیے اصول اور پالیسیاں وضع کی ہیں۔ اس کے پاس سٹیٹ بنک آف پاکستان کی اتھارٹی ہے اور تمام بنکوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک شریعہ اڈوائزر کا تقرر کرے جو بنک کی معاونت کے ساتھ اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ بنک کی مصنوعات اور معاملات شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔

ہم نے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ شریعہ اڈوائزر درس نظامی اور مدرسے کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بنکنگ کا علم بھی رکھتا ہو۔ تین مہ ہنے کے بعد بنکوں نے یہ شکایت کی کہ ہمیں کوئی ایک بھی (اور اس بات کو میں تاکید سے کہتا ہوں) آدمی ایسا نہیں ملا جو درس نظامی کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بنکنگ کے مسائل کا علم بھی رکھتا ہو۔ یہ لوگ بورڈ کے پاس آئے کہ اس ضابطے پر نظر ثانی کی جائے اوراب بورڈ اس ضابطے پر نظر ثانی کر رہا ہے تاکہ اس مہارت کے افراد دست یاب ہو سکیں جو بنکوں کے لیے کار آمد ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درسِ نظامی کے فضلا، ان کے موجودہ نظام کے لیے زیادہ اہل نہیں ہیں۔ ان کے پاس اداروں اور حکومت، نیز قوانین و ادوروں کے اسلامیانے کے عمل سے وابستہ باڈیز کو راہ نمائی فراہم کرنے کے لیے مناسب افراد نہیں ہیں۔ بنگلہ دیش میں ایک بڑا سلامی بنک کام کر رہا ہے اور یہ اسلامی بنک جدید دنیا کا ایک کام یاب اسلامی بنک ہے۔اگر اسے دینی اسکالرز کی ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے اور مدارس سے مطالبہ کرتا ہے، تو میرا خیال نہیں ہے کہ روایتی مدارس کوئی ایسی ماہرانہ کھیپ اسے مہیا کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس کے بعد ان بڑے چیلنجز کا نمبر آتا ہے جو اس وقت مسلمان امت کو در پیش ہیں۔ تقریباً دس سال پہلے ہنٹنگٹن نے ایک کتاب "تہذیبوں کا تصادم" کے نام سے تحریر کی تھی۔

فرض کیجیے کہ ایک دینی عالم سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کتاب کا جواب تحریر کرے تو برصغیر میں کراچی سے راس کماری تک یا خیبر سے چاٹ گانگ تک، درسِ نظامی کے کتنے فضلا یا کوئی ایک ہی فاضل ہے جو اس کتاب کا جواب تحریر کر سکے؟ میرا خدشہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ہے کہ ہماری دینی تعلیم پر نظر ثانی اور تشکیل نو ہونی چاہیے تاکہ مندرجہ ذیل پانچ میدانوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس میٹرک کے بعد ایک اچھا امام تیار کرنے کے لیے دو، تین یا چار سالہ کورس ہونا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس سکولوں سے میٹرک کی سند ہے، وہ حافظ اور قاری بھی ہے، تو اسے تین سالوں میں عربی اور قرآن کا متن مع ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے۔ اس کے ساتھ دو یا تین تفاسیر، ایک اردو یا بنگالی زبان میں اور ایک عربی میں، منتخب احادیث( مثلا مولانا منظور نعمانی کی "معارف الحدیث" یا مولانا بدر عالم میرٹھی کی "ترجمان السنہ") اور ایک عربی کا مجموعۂ حدیث جیسے مشکاۃ، دو تین اصولِ فقہ اور فقہ کی منتخب اچھی کتابیں جیسے قدیم کتابوں میں سے "ہدایہ" اور جدید کتابوں میں سے "الفقہ الحنفی و ادلتہ"، جدید معاشی، قانونی اور فقہی مسائل اور حکومتی و دستوری اور بین الاقوامی قانون وغیرہ امور سے متعلق کچھ کتابیں پڑھا دی جائیں۔ اس طرح ایک امام اس قابل ہو سکے گا کہ وہ مختلف مسائل پر پوچھے گئے مسائل کا جواب دے سکے۔ یہ نصاب میٹرک کے بعد تین سالوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔

تین سال کی اس بنیادی دینی تعلیم، جو انٹرمیڈیٹ یا اے لیول کے برابر ہے، کے بعد ایک دوسرا کورس دو، تین یا چار سالہ ان لوگوں کے لیے ہونا چاہیے، جو سکولوں اور کالجوں میں ذمے داریاں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کورس میں کچھ اضافی مضامین کے ساتھ مسلم امت کو پیش آمدہ موجودہ مسائل کے حوالے سے تعلیم بھی ہونی چاہیے۔

اس کے بعد موجودہ درس نظامی کا درجہ آتا ہے جو ان لوگوں کو پڑھانا چاہیے جو ان مدارس میں تدریس کرنا چاہتے ہیں، تاہم اس میں بھی ترمیم ناگزیر ہے۔

صرف و نحو وغیرہ کی کچھ غیر ضروری اور غیر مؤثر کتابیں نکال کی ان کی جگہ نئ کتابیں شامل کی جا سکتی ہیں اور اس کے علاوہ قدیم معقولات پر زیادہ زور دینے کے بجائے کچھ کتابیں نئے فلاسفرز اور جدید مغربی فکر کے حوالے سے شامل کرنا ضروری ہے۔ عربی اور اردو میں ایسی اچھی کتابیں موجود ہیں جن میں مغربی فکر کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں مستقبل کے مدارس کے اساتذہ کو پڑھانا ضروری ہیں تا کہ انھیں یہ احساس ہو سکے کہ وہ کس دنیا میں جی رہے ہیں اور امت مسلمہ کو کیا چیلنجز درپیش ہیں۔

پھر ہمیں امت کی عالمی سطح کی قیادت کی ذمے داری سنبھالنے، اداروں اور قانون کی تشکیلِ نو اور امت کے مستقبل کے لیے نئے نظام وضع کرنے کے لیے ایک اعلی درجے کا اسلامی نصاب درکار ہو گا۔

میری ناچیز رائے میں یہ اسلامی تعلیم کی مستقبل کی ضرورت ہے۔خوش قسمتی سے دنیا کے مختلف حصوں میں امت مسلمہ میں حال اور مستقبل کے حوالے سے ایک آگاہی اور شعور ابھر رہا ہے۔روایتی علما، جدید تعلیم یافتہ شخصیات اور دونوں روایات کو جمع کرنے والے حضرات نے بڑی تعداد میں ادارے قائم کیے ہیں۔میں بنگلہ دیش کے دو اداروں کی مثالیں دینا چاہوں گا: چٹاگانگ میں قائم بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی جس کا مقصد دینی تعلیم کو جدید علم کے ساتھ مربوط کرنا اور ایسے مسلمان اسکالرز تیار کرنا ہے جو معتدل رجحان کے حامل ہوں اور دین کے گہرے علم کے ساتھ اعلی عصری فہم رکھتے ہوں۔دوسرا ادارہ دارالاحسان یونی ورسٹی ہے جسے بیسویں صدی کے نام ور اسلامی فلسفی مرحوم پروفیسر سید علی اشرف نے قائم کیا تھا۔وہ مسلم امت کی مستقبل کی ضروریات کے حوالے سے بڑا شفاف موقف رکھتے تھے اور انھی کے افکار کی روشنی میں یہ یونی ورسٹی وجود پذیر ہوئی۔ان دو اداروں کے علاوہ علما کے قائم کردہ نسبتا چھوٹے

ادارے بھی ہیں۔مجھے بھی اس طرح کے ایک ادارے میں ایک بار جانے کا موقع ملا جہاں مدارس کے فضلا کو تین یا چار سال کے ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ان کو تخصص کی سطح پر فقہ (جدید قانون کے تقابل کے ساتھ)، حدیث (جدید چیزوں کے ساتھ مربوط کر کے) وغیرہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔یہ بات خود علما کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ ایک مسلمان عالم کو جدید وسائل اور دست رس کے ساتھ مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی بھی اس کی ایک مثال ہے جس میں انھی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے مذکورہ بالا دو اداروں کے سامنے ہیں۔ملیشیا، مصر اور دیگر کئی ممالک میں اس طرح کے ادارے وجود میں آ رہے ہیں لیکن وقت بہت کم ہے اور افسوس ہے کہ علما بہت سست روی کے ساتھ اس طرح کے امور کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔انھیں اس کام کی شدید اہمیت اور امت کو درپیش چیلنج کا احساس کرنا چاہیے ۔اگر وہ نئے پیراڈائم میں اپنے آپ کو منتقل کرنے میں سستی کریں گے تو وقت کا چکر انھیں خود ہی دھکیل کر پیچھے ڈال دے گا۔

تغیرات اور چیلنج بہت بڑے ہیں۔ چیلنج اور خطرے کی سنگینی پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ ہر کوئی اس سے آگاہ ہے۔ میں اپنی بات کا اختتام علما کو خطاب کرتے ہوئے، ایک فارسی شاعر کے شعر پر کروں گا(معذرت خواہ ہوں اگر آپ میں سے کوئی فارسی دان نہیں ہے)

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر۔۔۔ یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

شاعر اس کیفیت کو بیان کر رہا ہے جب کہ وہ محبوب کے قافلے کے ہم رکاب ہے۔ محبوب کی سواری لے جائی جا چکی ہے، ناقہ پیچھے ہے اور عاشق بے چارہ برہنہ پا ہے اور اسی کیفیت میں ناقہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس صورت حال میں وہ کہتا ہے کہ میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا اور میں ایک لمحے کے لیے کانٹے نکالنے رکا کہ اسی اثنا میں کارواں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

لمحوں کی خطا کی تھی، برسوں کی سزا پائی

اس لیے اگر ہم نے اپنی ذمے داری سے ایک لمحے کے لیے بھی تغافل برتا تو پھر قافلہ ہم سے سو سال کی مسافت کی دوری پر چلا جائے گا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ